انسانی اخلاقی اقدار اور فکرِ اقبال

منزہ صدیقی*

خلاصہ:

ایک شاعر، فلسفی اور مفکر کی حیثیت سے اقبال کی اہمیت مسلّمہ ہے۔ وہ اپنی ہر حیثیت میں انسانی اخلاقی اقدار پر یقین رکھتے ہیں اور ان کا برملا اظہار بھی کرتے ہیں۔ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اسے یہ شرف اسی بنا پر حاصل ہے کہ خیر و شر کی تمیز، بالفاظ دیگر اخلاقی اقدار کا احساس اس کی فطرت میں ودیعت کر دیا گیا ہے۔ اقبال کے نزدیک اخلاق کا انحصار احساس و عمل پر ہے۔ زندگی کی اخلاقی اقدار محض تصوراتی نہیں بلکہ انسان روزمرہ زندگی میں ان کا تجربہ کرتا ہے۔ احترامِ انسانیت کے ساتھ ساتھ اقبال چاہتے ہیں کہ انسان نئے اور اعلیٰ مقاصد کی تخلیق کرے جو اس کی اقدارِ حیات کے حامل ہوں۔ انسانی خودی ان اقدار و مقاصد کی تخلیق میں معاونت کرے اور خودی کی تعمیر سعی و جہد کے ذریعے ہو۔ انسان میں اعلیٰ مقاصد کے حصول کی لگن ہو جسے وہ عشق کا نام دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ سخت کوشی، جدوجہد، خواہشِ خطرات، مقاصد آفرینی، عدل و مساوات، ایمان ویقین، سعی و عمل، ضبطِ نفس وہ اقدار میں جو انسان کو دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتی ہیں۔ ان اقدار سے مزین انسان، انسانی خدمت کے جذبے سے سرشار ہو کر سوز و سازِ زندگی کا رمز شناس اور متوازن و ہم آہنگ شخصیت کا مالک بن جاتا ہے۔ آج تمام فلاسفہ و مفکرین اس امر پر متفق ہیں کہ اگر دم توڑتی انسانیت کو بچانا ہے تو اس کے ڈھانچے کو اخلاقی اقدار پر استوار کرنا ہو گا۔

اقبال کے نظامِ فکر میں اخلاقی اقدار کی اہمیت مسلّمہ ہے۔ اقبال کا فلسفہ اور فکر انسانی اخلاقی اقدار کا آئینہ دار ہے۔ وہ اپنی ہر حیثیت (ایک شاعر، فلسفی اور مفکر) میں انسانی اقدار پر یقین رکھتے ہیں۔ اپنے اشعار اور نثر میں اس کا برملا اظہار بھی کرتے ہیں۔ وہ انسان کی روحانی اور اخلاقی قوتوں کو سراہتے ہیں۔

رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید

ضمیر پاک و خیال بلند و ذوقِ لطیف

انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اسے دوسری تمام مخلوقات پر شرف و امتیاز اس بنا پر حاصل ہے کہ وہ خیر و شر کی تمیز رکھتا ہے۔ بالفاظِ دیگر اخلاقی اقدار کا احساس انسان کی فطرت میں ودیعت کر دیا گیا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

فالھمھا فجورھا و تقوٰھا (۱)

خیر و شر کا یہ احساس ہر زمانے، مذہب اور قوم کے لوگوں میں موجود رہا ہے۔ انسان فطرتاً خیر کا طالب اور شر سے گریزاں ہے۔ ہر انسان فطرتِ الٰہی پر پیدا کیا گیا ہے:

فطرۃ اللہ التی فطر النّاس علیھا (۲)

اگر انسان میں خیر و شر کی تمیز باقی نہ رہے تو وہ انسانیت کے درجے سے گر جاتا ہے۔ یہ انسانی اخلاقی اقدار ہی ہیں جو ہر اس انسان کو خواہ وہ کسی بھی مذہب، قبیلے، قوم، برادری یا نسل سے تعلق رکھتا ہو، تمام مخلوقاتِ عالم میں افضل بنا دیتی ہیں۔ اخلاقی اقدار کا احساس اور شعور انسان کا گہرا اور بنیادی تجربہ ہے۔

اقبال انسان میں یہی اخلاقی شعور پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ انسان کی نشوونما ہو یا تہذیب کی۔ اقبال کے خیال میں اگر وہ اخلاقی اقدار سے عاری ہے تو وہ اپنی تباہی کا سامان خود اپنے اندر پوشیدہ رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابلیس اپنے مشیروں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے

تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

جب تک اعلیٰ اخلاقی اقدار سامنے رہیں اور ان کے حصول کی کوشش کی جاتی رہے، افراد اور اقدام کی نشوونما جاری رہتی ہے۔

ابنِ خلدون اپنی کتاب مقدمہ ابنِ خلدون میں لکھتے ہیں کہ دنیاوی عروج و ترقی ان افراد اور اقوام کا مقدر بنی ہے جو اعلیٰ انسانی اخلاقی اقدار سے مزین ہوتی ہیں۔ اخلاق سے عاری افراد ہوں یا معاشرے، زوال پذیر ہو کر رہتے ہیں۔

انسانی اخلاقی اقدار کے متعلق اقبال کے نظامِ فکر کا مطالعہ کرنے سے قبل یہ بات سمجھ لینا ضروری ہے کہ اقبال کے نزدیک انسانی اقدار دراصل اسلامی اقدار ہیں۔ وہ جہاں کہیں بھی مسلمانوں سے مخاطب ہوتے ہیں تو ان کا روئے سخن تمام عالمِ انسانیت کی جانب ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک اسلام دینِ فطرت ہے اور تمام انسانوں کا فطری مذہب ہے۔ وہ اسلامی تہذیب کے متعلق کہتے ہیں:

عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال

عجم کا حسنِ طبیعت، عرب کا سوزِ دروں

اقبال نے فلسفہ و الٰہیات کا گہرا مطالعہ کر رکھا تھا۔ جدید و قدیم مباحث پر ان کی پوری نظر تھی۔ چنانچہ اس وسیع و عمیق علم کے ساتھ انہوں نے انسان کی زندگی میں اخلاقی اقدار کے اثبات پر روشنی ڈالی۔ اقبال نے اخلاقیات کے متعلق کلاسیکی اور رواقی مفکرین کے تصورات سے اختلاف کیا۔ کلاسیکی مفکرین کے مطابق انسانی زندگی مجبوری کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ جس میں آزادی نام کو نہیں۔ اس تہذیب میں اخلاق کی حیثیت محض تصوراتی تھی، جس کا عمل کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ جبکہ اقبال نے اسلامی تہذیب کو اس کلاسیکی تہذیب کا ردّ عمل قرار دیا۔ اقبال نے واضح کیا کہ تہذیبی ترقی کے لیے اخلاقی ترقی کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ درحقیقت یہ اخلاق ہی ہیں جو تہذیبی عمارت کو بنیاد بھی فراہم کرتے ہیں اور آگے بڑھنے کے اسباب بھی۔ اخلاق کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر اقبال نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس ۱۹۳۰ء میں کہا تھا:

''یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ بحیثیت ایک اخلاقی نصب العین اور نظام سیاست کے (اس آخری لفظ سے میرا مطلب ایک ایسی جماعت ہے جس کا نظم وانضباط کسی نظامِ قانون کے ماتحت عمل میں آتا ہو اور جس کے اندر ایک مخصوص اخلاقی روح سرگرم کار ہو۔ اسلام ہی وہ سب سے بڑا جزو ترکیبی تھا جس سے مسلمانانِ ہند کی تاریخ حیات متاثر ہوئی۔۔۔ اسلامی تمدّن کے اندر ایک مخصوص اخلاقی روح کارفرما ہے۔''(۳)

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال انسان میں اس اخلاقی شعور کو پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ شعور انفرادی بھی اور اجتماعی بھی۔ ''اس کا مطلب انسان کی زندگی کو عملاً ایک نئے سانچے میں ڈھالنا ہے اور اس کے جذبات و احساسات کی دنیا کو یکسر پلٹ دینا ہے۔''(۴)

اقبال کا نظریۂ اخلاق انسان کو آمادۂ عمل کرتا ہے۔ اخلاقیات سے عاری، نطشے کے فوق البشر اور عمل سے گریز پا صوفیانہ تصور کے برعکس اقبال نے اخلاقی اقدار سے مزین انسان کا تصور پیش کیا۔ جو زندگی کی جدوجہد میں پوری طرح شامل ہے۔ وہ صلاحیتوں سے مالا مال ہے اور اس کی اخلاقی صفات اسے اس قابل بناتی ہیں کہ وہ خودی کے تینوں مراحل (۱) اطاعتِ الٰہی، (۲) ضبطِ نفس اور (۳) نیابتِ الٰہی طے کرنے کے بعد زمین پر خلیفۃ اللہ ہونے کا فرض ادا کر سکے۔ خودی کی یہ منازل طے کرنے کے لیے کچھ اقدار و صفات کا اپنانا لازمی ہے۔

ایمان و یقین اس انسان کی بنیادی قدر ہے جس کی بنا پر وہ زندگی کے میدان میں کامیابی و کامرانی حاصل کرتا ہے۔ یہ انسان جلال و جمال کا مرکب ہے:

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم

رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

یقین وہ بنیادی صفت ہے جو رزم گاہِ حیات میں سے انسان کو اخلاقی علو حاصل کرنے کے لیے آمادۂ عمل کرتی ہے۔ انسان شک و تخمین سے نکل کر پورے اعتماد کے ساتھ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے سرگرمِ عمل ہو سکتا ہے، لیکن اس کی یہ جدوجہد اخلاقی حدود کی پابند ہے۔

یقین کی اہمیت اُجاگر کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں:

یقیں پیدا کر اے ناداں! یقیں سے ہاتھ آتی ہے

وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

اقبال کے خیال میں انسان کی ذات کی تکمیل کے لیے سب سے پہلا مرحلہ نئے مقاصد کی تخلیق کرنا ہے جو اس کی اقدارِ حیات کے حامل ہوں۔

ان مقاصد کے ذریعے انسان سعی و عمل پر آمادہ ہوتا ہے۔ اپنے سامنے بلند مقاصد رکھنے اور ان کے حصول کی جدوجہد میں انسان اس قابل ہوتا ہے کہ وہ اچھے یا بُرے اعمال کے نتائج پر غور کرے۔ اچھے اعمال میں اضافہ و ترقی کرے اور برے اعمال سے پرہیز کی راہ اختیار کرے۔ یہاں یہ نکتہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ اقبال نے مقاصد کی تخلیق کو مذہب و اخلاق کے ساتھ وابستہ کر کے انسان کی اخلاقی اور مادی زندگی کو ہم آہنگ کر دیا ہے۔

گر ہنر میں نہیں تعمیر خودی کا جوہر

وائے صورت گری و شاعری و نالے و سرود

یہ مقاصد جس قدر اعلیٰ و ارفع ہوں گے، انسانی ذات اتنا ہی بلندی کی جانب محوِ پرواز رہے گی۔ ان مقاصد میں بلند ترین خودی کا استحکام اور اس کا تحفظ ہے۔ یہ اس قدر اعلیٰ مقصد ہے کہ دوسری اقدار درحقیقت اس اعلیٰ ترین مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔

اقبال کا نظریہ یہ ہے کہ خودی اپنے ارتقاء کی حد کو پہنچ کر بھی اپنے خالق کو نہیں بُھولتی، بلکہ اس کی آزادی ہمیشہ خالق کی مرضی کے تابع رہتی ہے۔ یہی اخلاق کی معراج ہے۔ فلاسفہ یونان کی پیدا کردہ کلاسیکی تہذیب نے man is

the measure of all things کہہ کر انسان کی ذات کو انسان کا منتہا تو قرار دے دیا لیکن وہ خودی کو جمود سے باہر نہ نکال سکی۔ اس نے انسان کو فطرت کے ہاتھوں میں مجبور محض بنا کر پیش کیا جس کے اچھے یا بُرے اخلاق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور جہاں خواہشات، جذبات کو دبا دینا نیکی کی معراج ہے۔ جبکہ اقبال کے نظریے کے مطابق انسانی خواہشات و جذبات کو نظم و ضبط کا پابند کرنا اخلاقی فتح ہے۔ اگر ان جذبات کو منضبط کر دیا جائے تو یہی ایک زبردست قوتِ محرکہ بن جاتے ہیں۔ انہیں اعلیٰ مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا جاسکتا ہے، اسی کو وہ خودی کی حفاظت سے تعبیر کرتے ہیں:

اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات

نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ

زندگی میں اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے لگن اور تڑپ ہونی چاہیے۔ اس لگن کو اقبال عشق کا نام دیتے ہیں۔ اقبال نے عشق کو انتہائی وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے اور اسے اخلاقیات کا اہم حصہ قرار دیا ہے، جس کے ذریعے انسان خودی کی منازل طے کرتا اور اپنی شخصیت کی تعمیر کرتا ہے:

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی

نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

یہ عشق انسان کو مسلسل سرگرمِ عمل رکھتا ہے اور زندگی میں آگے بڑھتے چلے جانے کے لیے مہمیز کا کام دیتا ہے:

ہر لحظہ نیا طور، نئی برق تجلی

اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

اسلام نے سعی و عمل کو زندگی کا بنیادی اصول قرار دیا ہے۔ اقبال بھی انسان کی اخلاقی زندگی میں اسے بنیادی قدر قرار دیتے ہیں۔

وہ بے عملی کو موت سے تعبیر کرتے ہیں:

اس راہ میں مقام بے محل ہے

پوشیدہ قرار میں اجل ہے

زندگی میں خواہ کتنے بھی اعلیٰ مقاصد متعین کیوں نہ کر لیے جائیں، عمل کے بغیر ان کا حصول ناممکن ہے۔ عمل ہی کے ذریعے انسانی فطرت ارتقاء پاتی ہے اور اہداف کو حاصل کرنے کے لیے انسان کو سرگرمِ عمل کرتی ہے:

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم

جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

پیہم عمل کے ذریعے خودی کی تعمیر ہوتی ہے۔ اس طرح ایک بامقصد زندگی وجود میں آتی ہے۔ خیر و شر، نیکی و بدی انسان سے الگ کوئی وجود نہیں رکھتے بلکہ یہ اس عمل کے نتائج میں مضمر ہوتے ہیں۔ انسان سعی و عمل کے ذریعے اخلاقی بلندی کا سفر مسلسل جاری رکھتا ہے۔

نتائج کی پرواہ کیے بغیر سعی و عمل جاری رکھنا ایک اہم اخلاقی قدر ہے۔ اخلاق کی دنیا میں اصل اپنا فرض ادا کرنا اور کوشش کرنا ہے:

رازِ حیات پُوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے

زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش ناتمام سے

اخلاقی بلندی کے سفر میں پیش آنے والی مشکلات و رُکاوٹوں کو صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کرنا اصل زندگی ہے۔ خود کو حوادثِ زمانہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا صبر نہیں بلکہ پوری پامردی کے ساتھ ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنا اور پھر اپنی مرضی کے نتائج کے لیے بے صبری نہ دِکھانا اصل صبر و استقلال ہے۔ صبر کرنے والا فرد لازمی طور پر بلند عزم رکھتا ہو گا، کیونکہ جب تک انسان بلند عزم نہ ہو وہ صبر و استقلال سے کام نہیں لے سکتا۔

ادنیٰ مقاصد رکھنے والا شخص تنکوں کی مانند ہوتا ہے، جسے زمانے کی ہوائیں جدھر چاہے اُڑائے لئے پھرتی ہیں، جبکہ بلند عزائم رکھنے والا شخص، بلند مقاصد کے حصول کے لیے مشکلات کے بڑے سے بڑے پہاڑ سے ٹکرا جاتا ہے۔

خودی میں ڈوبنے والوں کے عزم و ہمت نے

اس آبجو سے کیے بحر بیکراں پیدا

فکر اقبال کی روشنی میں اخلاقی اقدار کا جائزہ لیا جائے تو وہاں فقر کا بھی بہت اونچا مقام نظر آتا ہے۔ عشق کی طرح اقبال نے فقر کو بھی نئے معانی پہنائے ہیں۔ اقبال کے ہاں فقر بے چارگی و مسکینی کا ہم معنی نہیں ہے بکہ یہ دنیاوی وسائل سے استغنیٰ کا نام ہے۔ فقر یہ ہے کہ دنیا جہان کے اسباب انسان کی دسترس میں ہوں اور انسان ان کی پروا نہ کرے۔ دنیاوی اسباب سے تہی دستی بھی انسان کو پریشان نہ کرے۔

فقر کو اگر مکمل روح کے ساتھ اختیار کر لیا جائے تو یہ افراد اور اقوام کی زندگی کو بدل کر رکھ دیتا ہے:

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ

فقر ہے میروں کا میر، فقر ہے شاہوں کا شاہ

اقبال کے نزدیک اعلیٰ اخلاقی معیار حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان میں خواہشِ خطرات موجود ہو۔ اس سے مراد بلاضرورت خطرات میں کود پڑنا نہیں، بلکہ بوقتِ ضرورت 'کشتیاں جلا ڈالو' کا نعرۂ مستانہ لگا کر اپنی فوج کو سر دھڑ کی بازی لگوانے کا خطرہ مول لے کر تاریخِ اسلامی کے ایک روشن ترین باب کو تحریر کرنا ہے۔

میری میں، فقیری میں، شاہی میں، غلامی میں

کچھ کام نہیں بنتا، بے جرأتِ رندانہ

انفرادی اقدار میں عزّتِ نفس، خودداری، سکون و وقار، بہادری و شجاعت، صداقت و دیانت، ذوقِ لطیف، بصیرت، اُمید، پیش قدمی، علم، قوت (جو اخلاقی حدود کی پابند ہو) وغیرہ وہ اقدار ہیں جو انسان کی شخصیت کو استحکام بخشتی ہیں۔ اس کی خودی کی تعمیر کرتی ہیں اور اسے اس مقام تک لے آتی ہیں جہاں وہ اخلاقی بلندیوں کو چھونے لگتا ہے۔ اور یہ مقام حاصل کر لیتا ہے:

ہاتھ ہے اللہ کا، بندہ مومن کا ہاتھ

غالب و کار آفریں، کارکشا کارساز

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات

ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ قومیں افراد سے مل کر بنتی ہیں۔ جہاں افراد کے کردار کی تشکیل ضروری ہے، وہیں عالمِ انسانیت کی بہتری کے لیے اقوام کے مجموعی مزاج کو بھی اخلاقی اقدار سے آراستہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اقبال کے فلسفۂ اجتماعی اخلاق پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے خیال میں فرد اور معاشرہ مل کر تمدن کی عمارت تعمیر کرتے ہیں۔ انسان انفرادی اخلاق سے آراستہ ہو کر اس قابل ہو جاتا ہے کہ تمدن کی عمارت تعمیر کرنے اور اسے مضبوط بنانے کے لیے اپنے اوپر کچھ پابندیاں عائد کر لے یا بعض اصولوں کی پابندی کو اپنے اوپر لازم قرار دے لے، کیونکہ اسی میں حقیقی آزادی پوشیدہ ہے:

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بہ گل بھی ہے

انہی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تُو کر لے

انفرادی مقاصد کے حصول سے گزر کر اجتماعیت کی تعمیر کرنے میں اسلام نے انسانی فطرت کا پورا خیال رکھا ہے۔ وہ افراد کو اس طرح تیار کرتا ہے کہ شخصیت کی انفرادیت بھی برقرار رہے اور وہ معاشرے کا مفید رکن بھی بن سکے۔ یہ توازن و ہم آہنگی ایک بنیادی اخلاقی قدر کے طور پر ہم اقبال کے ہاں بھی دیکھتے ہیں:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

ان کی شاعری میں جا بجا ایسے اشارے موجود ہیں جو اجتماعی اخلاقی اقدار کی جانب رہنمائی کرتے ہیں۔ اس حوالے سے بنیادی انسانی قدر احترامِ انسانیت ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

''لوگو! اپنے رب سے ڈرو، جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑ بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیے۔''(۵)

اقبال نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے:

برتر از گردوں مقامِ آدم است

اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

جس طرح فرد کی شخصیت میں خودی کا احساس، اس کی تعمیر و استحکام بنیادی اہمیت رکھتے ہیں اسی طرح اقوام کی زندگی میں اجتماعی خودی کی بھی بہت اہمیت ہے:

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم

کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

اجتماعی خودی کی تربیت کے لیے حریت، مساوات اور اخوّت بنیادی اقدار ہیں۔ حریت سے مراد صرف جسمانی یا سیاسی آزادی نہیں بلکہ روح و فکر کی آزادی ہے۔ اس سے مراد ہر طاغوت کا انکار ہے، خواہ وہ کسی فرد کی شکل میں ہو یا نظام کی۔ یہ آزادی انسان کو ایسے سجدہ کا سبق دیتی ہے جو اسے خالق کے علاوہ کہیں بھی جُھکنے سے بے نیاز کر دیتی ہے:

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے

ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

کسی قوم کے اجتماعی کردار میں عدل و مساوات بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ عدل زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہے، خواہ یہ انفرادی ہو، معاشی یا معاشرتی۔ اقبال اپنے اشعار میں اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تمیز بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

اجتماعی اخلاقی اقدار میں اقبال اخوت کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ خصوصیت قوم کو یکجا کر دیتی ہے۔

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوعِ انساں کو

اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا

کسی قوم کے اجتماعی وجود کے لیے بہت ضروری ہے کہ ان کو باہم یکجا رکھنے کے لیے کوئی قوت موجود ہو جو افرادِ اقوام کو کسی عمارت کی اینٹوں کی مانند ایک دوسرے سے جوڑے رکھے:

ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملّت

وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد

اقبال کے خیال میں توحید وہ قوت ہے جو عالمِ انسانیت کو یکجا کر سکتی ہے:

بازو تیرا توحید کی قوت سے قوی ہے

اسلام تیرا دین ہے تو مصطفویؐ ہے

جیسا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد دسمبر ۱۹۳۰ء کے خطبے میں انہوں نے فرمایا:

''اگر آج آپ اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جما دیں اور اس کے زندگی بخش تخیل سے متاثر ہوں تو آپ کی منتشر اور پراگندہ قوتیں از سرِ نو جمع ہو جائیں گی اور آپ کا وجود ہلاکت و بربادی سے محفوظ ہو جائے گا۔''(۶)

غرض اقبال نے ایک طرف تو افراد کی سیرت کی تعمیر پر زور دیا تاکہ ان کی قوّتِ عمل میں اضافہ ہو اور وہ اپنی خودی کی حفاظت کر سکیں، اور دوسری جانب تعمیرِ اقوام کے اخلاقی اصولوں کی جانب بھی اشارہ کیا، کیونکہ اجتماعی تنظیم ہی سے اقوامِ عالم میں نمایاں مقام حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اخلاقی اقدار سے مزیّن افراد اور اقوام ہی انسانیت کا اصل حُسن ہیں۔

آج کا انسان اور معاشرہ اپنے جوہر یعنی انسانیت سے محروم ہو چکا ہے، جس کا نتیجہ انسانی اور اخلاقی پستی کی نت نئی شکلوں کی صورت میں سامنے آتا رہتا ہے۔ جب تک افراد و اقوام کو اخلاقی اقدار سے آراستہ نہ کیا جائے، تہذیب و تمدّن کی حقیقی ترقی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا، خواہ سائنس و ٹیکنالوجی اپنی ترقی کی انتہا کو کیوں نہ چُھولے۔ مشرق و مغرب کے مفکّرین اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ اگر انسانیت کو مکمل بربادی سے بچانا ہے تو اُس کے ڈھانچے کو اخلاقی بنیادوں پر استوار کرنا ہو گا اور متوازن نظامِ اخلاق وہی ہے جو اقبال نے پیش کیا ہے، جو نہ تو نطشے کی مانند صرف جلال پر مشتمل ہے اور نہ صوفیانہ طرز پر ترکِ دُنیا کی تعلیم دیتا ہے، بلکہ ان کی درمیانی راہ اختیار کرتے ہوئے افراد اور اقوام کو سعی و عمل کے ذریعے خود اپنی دنیا پیدا کرنے کا درس دیتا ہے۔ افراد و اقوام کے لیے اقبال کا پیغام یہی ہے:

غافل نہ ہو خودی سے کر اپنی پاسبانی

شاید کسی حرم کا تو بھی ہے آستانہ

حواشی

1. القرآن، سورۃ الشمس، آیت نمبر ۸
2. الحدیث، مشکوٰۃ المصابیح، حدیث نمبر ۹۰
3. حرفِ اقبال، ص ۱۸ ۔ ترتیب و ترجمہ: لطیف احمد خان شیروانی، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔ پہلی اشاعت: اگست ۱۹۸۴ء
4. حرفِ اقبال، ص ۲۵۱ ۔ ترتیب و ترجمہ: لطیف احمد خان شیروانی، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔ پہلی اشاعت: اگست ۱۹۸۴ء
5. القرآن، سورۃ النسائ، آیت نمبر ۱
6. حرفِ اقبال، ص ۵۸ ترتیب و ترجمہ: لطیف احمد خان شیروانی، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔ پہلی اشاعت: اگست ۱۹۸۴ء

کتابیات

1. القرآن الکریم
2. اقبال، علامہ، محمد: کلیاتِ اقبال (اُردو)، الفیصل ناشران، لاہور۔ ۱۹۹۹ء
3. بزمِ اقبال: فلسفہِ اقبال، بزمِ اقبال۔ ۱۹۸۴ء
4. خان، لطیف احمد، شیروانی: حرفِ اقبال، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی۔ ۱۹۸۴ء
5. رزاقی، مشاہد حسین، اقبالیات خلیفہ عبدالحکیم، شیخ غلامی علی اینڈ سنز۔ ۱۹۹۸ء
6. رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، سہیل عمر، محمد، وحید عشرت، ڈاکٹر: اقبالیات کے سو سال، اکادمی ادبیات، پاکستان، اسلام آباد۔ ۲۰۰۲ء
7. سعید احمد رفیق: اقبال کا نظریہ اخلاق، ادارہِ ثقافت اسلامیہ۔ ۱۹۶۰ء
8. صابر، غلام: اقبال شاعرِ فردا، اقبال اکادمی، پاکستان۔ ۲۰۰۶ء
9. محمد طفیل (مدیر): نقوش: اقبال نمبر، ادارہِ فروغ اُردو ۱۹۷۷ء
10. منور، محمد، پروفیسر: ایقانِ اقبال، اقبال اکادمی، پاکستان۔ ۱۹۹۴ء
11. ندوی، عبدالسلام، مولانا: اقبالِ کامل، آتش فشاں پبلی کیشنز۔ ۱۹۹۲ء
12. وحید عشرت، ڈاکٹر: اقبال 86ئ، (مقالات) اقبال اکادمی، پاکستان۔ ۱۹۹۰ء
13. یوسف حسین خان، ڈاکٹر: روحِ اقبال، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی۔ ۱۹۵۲ء
14. یوسف عزیز: شعاعِ اقبال، مجید بک ڈپو، فیصل آباد، لاہور۔ ۱۹۷۷ء